Oct
2024

رائے بریلی

ماہنامہ

پیام عرفات

وقت کی سب سے بڑی خیر خواہی

''اس وقت کی سب سے بڑی عقل مندی اور سب سے بڑی اپنے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اسلام کے لیے، اسلام کو چمکانے کے لیے، اسلام کو پھیلانے کے لیے، مسلمانوں کو اپنے دین میں مضبوط کرنے کے لیے اور ان کو سچا اور پکا مسلمان بنانے کے لیے ایک مرتبہ اس کا بیڑہ اٹھاؤ اور ایک بار دیوانہ وار کام میں لگ جاؤ اور اپنے آپ کو جھونک دو کہ یہاں کا ہر کلمہ گو مسلمان پکا اور سچا مسلمان ہو جائے کہ بڑے سے بڑا زلزلہ اور بڑے سے بڑا طوفان اور بڑے سے بڑا بھونچال اس کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی

قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

’’قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل امید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے اور خواہ ناکامی اور مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو مگر امید کا طائر مقدس ان کے دل کے گوشے سے نہیں اڑتا- وہ دنیا کو ایک کارگاہِ عمل سمجھتے ہیں اور امید کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمہارے ہی لیے ہے- اگر آج تم اس پر قابض نہیں تو غم نہیں، کیوں کہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لیے ہونے والی ہے،- مصیبتیں جس قدر آتی ہیں وہ ان کو صبر و تحمل کی ڈھال پر روکتے ہیں اور غم واندوہ سے اپنے دماغ کو معطل نہیں ہونے دیتے، بلکہ مصیبتوں کو دور کرنے اور ان کی صفوں پر غالب آنے کی تدابیر پر غور کرتے ہیں- نامرادی ان کے دلوں کو مجروح کرتی ہے، پر مایوس نہیں کرتی اور غم کے لشکر سے ہزیمت اٹھاتے ہیں، پر بھاگتے نہیں۔

دنیا ایک میدان کارزار ہے اور جس چیز کو تم ’’عمل‘‘ کہتے ہو- دراصل یہ ایک حریفانہ کش مکش اور مقابلہ ہے- پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں، وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں- اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے، اسے کامیابی اور ناکامی اور فیروزمندی و نامرادی سے چارہ نہیں- کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو، کیوں نہ ہم اپنے سر و سینے میں بھی زخم کے نشان پائیں- بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا- لیکن سپاہیوں کو زخموں پر زخم کھا کر بھی اف نہیں کرنا چاہیے- کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں بلکہ میدان جنگ ہے۔

میں نے کہا کہ قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر فرد ایک پیکر امید ہوتا ہے اور اپنے دل کو امید کی جگہ سمجھتا ہے نہ کہ مایوسی کی، لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زندہ قوموں کے لیے مایوسی کے اسباب میں امید کا پیغام ہوتا ہے اور مصیبتیں جتنی بڑھتی ہیں، اتنی ہی وہ اپنی امید کو اور زیادہ محبت اور پیار سے پالتے ہیں۔

مصیبتیں ان کو مایوس نہیں کرتیں، بلکہ غفلت سے ہوشیار کر دیتی ہیں اور عبرت و تنبیہ کی صورت میں ان کے سامنے آتی ہیں، وہ مصائب کے سیلاب کو دیکھ کر بھاگتے نہیں بلکہ اس راہ کو ڈھونڈ کر بند کرنا چاہتے ہیں، جہاں سے اس نے نکل کر بہنے کی راہ نکالی ہے۔ پس مصائب ان کے لیے ہو جاتے ہیں اور نامرادی ان کے لیے کامیابی کا دروازہ کھول دیتی ہے، وہ جس قدر کھوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ پاتے ہیں اور جتنا زیادہ گرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ مستعدی سے اٹھتے ہیں۔ وہی دنیا جو کل تک ان کے لیے نامرادیوں کی دوزخ تھی، یکا یک کامیابیوں کا بہشت بن جاتی ہے اور جس طرف دیکھتے ہیں، تخت فتح یابی بچھے ہوئے اور انہار کامرانی بہتی نظر آتی ہیں۔‘‘

(قرآن کا قانون عروج و زوال: ۱۲۱-۱۲۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۶ ربیع الآخر ۱۴۴۶ھ-اکتوبر ۲۰۲۴ء شمارہ: ۱۰

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

بدترین حرام

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

”أَلَا أُنَبِّئُكُمْ مَا الْعَضْهُ؟ هِيَ النَّمِيمَةُ الْقَالَةُ بَيْنَ النَّاسِ.“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(کیا میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ بدترین حرام کیا ہے؟ یہ چغلی ہے جو لوگوں کی زبان پر رواں ہو جاتی ہے۔)

(صحیح مسلم: ٦٦٣٦)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 E-Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

لمحہ فکریہ (اداریہ).. ۳

.... بلال عبدالحی حسنی ندوی

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی حفاظت کا واحد راستہ.......... ۴

.... حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مسلمانوں کا تحفظ کیوں اور کیسے؟.............................. ۶

.... حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

خواتین کے تحفظ کا اسلامی طریقہ................................ ۸

.... مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

تقویٰ کیا ہے؟.. ۱۰

.... بلال عبدالحی حسنی ندوی

طلاق کے چند مسائل.. ۱۲

.... مفتی راشد حسین ندوی

کیوں ہر طرف تو خوار ہوا احتساب کر.......................... ۱۴

.... مولانا محمد طاہر ندوی

نسخہ کیمیا... ۱۶

.... جناب ریاض فردوسی صاحب

مولانا علی میاں ندویؒ اور اہل عرب.............................. ۱۷

.... محمد ارمغان بدایونی ندوی

جب سر میں ہوائے طاعت تھی

نتیجۂ فکر:- اکبر الہ آبادی

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا
ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا
مرغانِ خوش الحاں ہو گئے چپ آہو نے اچھلنا چھوڑ دیا
کیوں کبر و غرور اس دور پہ ہے کیوں دوست فلک کو سمجھا ہے
گردش سے یہ اپنی باز آیا یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا
بدلی وہ ہوا گزرا وہ سماں وہ راہ نہیں وہ لوگ نہیں
تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا
وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا
ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا
کیا دین کو قوت دیں یہ جواں جب حوصلہ افزا کوئی نہیں
کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا
اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں
اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے ابلنا چھوڑ دیا
اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا
جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا
اس حور لقا کو گھر لائے، ہو تم کو مبارک اے اکبر
لیکن یہ قیامت کی تم نے گھر سے جو نکلنا چھوڑ دیا

بلال عبدالحی حسنی ندوی

لمحۂ فکریہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کسی تقریر میں کہا تھا: ''نہ معلوم کتنے وہ نام کے مسلمان ہیں جو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن ہورہے ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں۔'' موجودہ صورتِ حال اسی کی غماز ہے، جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کو نہ دین پر اطمینان، نہ عقیدۂ توحید سے وہ واقف ہے اور نہ ہی آخرت کا یقین اس کے دلوں میں ہے۔

جدید نظام تعلیم کی چکی میں پس کر اس کا ذہن ایسا مادّہ پرست بن گیا ہے کہ اس سے اوپر سوچنے کی صلاحیت ہی لگتا کہ ختم ہوگئی ہے، اس پر طرفہ یہ کہ اس کو اپنے علم پر ناز ہے اور وہ دینی مسائل میں بھی خامہ فرسائی کرنے سے نہیں چوکتا، ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو دین کے نام پر دین کی بنیادیں ہلا دینا چاہتے ہیں، ان کے لیے ''نادان دوست'' کا خطاب شاید زیادہ درست ہو، وہ دین کو زمانے کے رخ پر لانا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اس کے لیے مسلماتِ دین میں بھی تبدیلی کرنی پڑے تو حرج کی بات نہیں، ایسے لوگوں کے قلم سے اسلام کا بالکل نیا چہرہ سامنے آرہا ہے، ایک عام مسلمان کے لیے تو یہ زیادہ خطرہ کی بات نہیں لیکن تعلیم یافتہ طبقے کے لیے یہ خطرہ کی گھنٹی ہے۔

ایک طرف تعلیم سے دور وہ طبقہ ہے جو ہندوانہ رسم ورواج میں گھر کر بالکل ہی دین سے بے بہرہ ہے، بعض بعض علاقوں کے بارے میں یہاں تک معلوم ہوا کہ وہاں کے مسلمان مندروں میں جانا محض ایک رسم سمجھتے ہیں اور رسم کے طور پر انجام دینا برا نہیں سمجھتے، مسلمانوں کی پہچان مٹتی جارہی ہے، تو دوسری طرف تعلیم کے عنوان سے ایسے ذہن بنائے جارہے ہیں جو مغربی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں، اسلامیت کو اس طرح کھرچ دیا جاتا ہے کہ اس کے آثار بھی باقی نہیں رہتے، پھر جو لوگ جتنے ایڈوانس (Advanced) ہوتے جاتے ہیں، اسلام ان کی زندگی سے نکلتا جاتا ہے، نام مسلمانوں کے رہ جاتے ہیں لیکن اسلام باقی نہیں رہتا۔ جدید علوم کے بارے میں بہت سے لوگوں نے سوچ لیا ہے کہ اسلام ان کا ساتھ نہیں دے سکتا، یہ سوچ تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، مسلمان تو ان علوم کے بانی ہیں، خود یورپ کے مفکرین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے ان علوم کی بنیادیں نہ ڈالی ہوتی تو آج دنیا کئی سو سال پیچھے ہوتی۔

دنیا کا کوئی مذہب ان ترقیات کا ساتھ دے سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے، عیسائیت جو دنیا کا سب سے بڑا مذہب (اپنے پیروکاروں کے اعتبار سے) سمجھا جاتا ہے، اپنی حقیقت کھو چکا، خود عیسائیوں میں ایک طبقہ ایسا پایا جاتا ہے جو موجودہ تحریف شدہ عیسائیت سے سخت بیزار ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں، اس کی بنیادی وجہ مغربی نظام تعلیم ہے، جس سے دین سے بیزاری پیدا ہورہی ہے، عام طور پر عصری دانش گاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں دین کے ساتھ استہزاء کا انداز ہوتا ہے اور اس کو از کار رفتہ قرار دیا جاتا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی ترقی یافتہ جدید علوم کے ماہرین نے بطور مذہب کے صرف عیسائیت کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے انھوں نے یہ اندازہ کرلیا کہ یہ مذہب علم کا شدید مخالف ہے، عیسائیت کی تو انھوں نے شکل مسخ کردی اور اس کو کنارے لگا دیا، اسلام کے بارے میں بھی انھوں نے وہی تصور قائم کرلیا، افسوس ان تعلیم یافتہ مسلمانوں پر ہے جو مغرب کے خوشہ چیں ہیں اور انھوں نے بھی اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ دونوں مذاہب بالکل الگ الگ اصول ونظریات کے حامل ہیں، مسیحی اصولوں کو اسلام پر تھوپا نہیں جاسکتا۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی حفاظت کا واحد راستہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

میرے دوستو! تم تجارت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ گئے، پیسوں میں آگے بڑھ گئے، کیا تیر مارا تم نے؟ وہ لاکھ پتی تھا، تم کروڑ پتی بن گئے، نہ وہ اپنا سرمایہ قبر میں لے جائے گا، نہ تم لے جاؤ گے، وہ بھی خالی ہاتھ جائے گا، تم بھی خالی ہاتھ جاؤ گے، لیکن کروڑ پتی کو زیادہ صدمہ ہوگا، زیادہ عسرت ہوگی، لاکھ پتی کو کم ہوگا اور جو ہزاروں کا مالک ہوگا، اس کو اس سے کم ہوگا اور سینکڑوں کا جو مالک ہوگا، اس کو اس سے کم ہوگا اور جو بے چارہ خالی ہاتھ ہوگا، اس کو تو کوئی افسوس نہ ہوگا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ لاکھ سے جو کروڑ بنا رہے ہیں، وہ حسرت ہی تو بڑھا رہے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ حسرت کا سامان کر رہے ہو، لیکن اگر تم نے اپنے نامہ اعمال میں اسلام کی ترقی لکھوائی اور تمہارے حصے میں کچھ مسلمان آگئے اور اس ملک میں دین پھیلایا تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے لیے پھر ایسا انعام ہے کہ یہ دنیا تو اس کی گنجائش ہی نہیں رکھتی۔ یہ تو اُس عالم میں دیا جاسکتا ہے۔

میرے دوستو! یہ دنیا فانی ہے، اس زندگی کی ہر چیز فانی ہے، دولت فانی، عزت فانی، حکومت فانی، اہل حکومت سن لیں، یہ ان کی حکومتیں جانے والی ہیں، دولت والے سن لیں کہ دولت ان سے بے وفائی کرنے والی ہے، صحت والے سن لیں کہ یہ صحت ان سے منہ چرانے والی ہے، جو چیز باقی رہے گی وہ صرف اللہ کا نام ہے اور اللہ کے راستے میں محنتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے جانفشانی، کوشش اور جدوجہد ہے، بڑا غنیمت وقت ہے جو گذر رہا ہے، اس میں اگر تم نے اپنے کاروبار سے وقت نکال کر کے ہدایت وتبلیغ کا اپنے اندر طریقہ پیدا کیا اور پھر اس کے لیے کوشش کر لی تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے انعام میں دنیا میں تم کو بہت دے دے گا اور آخرت میں تم کو جنت عطا فرمائے گا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو! تم اس ملک میں نہیں رہ سکتے، یہ میں آج سیاسی آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس روشنی میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر مسلمان کو عطا فرمائی ہے، اس روشنی میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس ملک میں تمہارا رہنا مشکل ہوجائے گا، اگر تم نے دین کے لیے خلوص کے ساتھ کام نہ کیا اور جب وہ حالت پیدا ہوگی تو اس وقت نہ تمہاری دوکانیں محفوظ ہوں گی، نہ تمہارے کارخانے محفوظ رہیں گے۔ یاد رکھو! حفاظت کا سامان اوپر سے ہوتا ہے، کسی ملک میں مسلمانوں کی حفاظت کا سامان اوپر سے ہوتا ہے، کسی ملک میں مسلمانوں کی حفاظت کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ وہ دین کے لیے جدوجہد کرے اور دین کو اتنا طاقتور بنائے کہ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس قوم کی حفاظت اپنی طرف سے فرمائے، ان کی نصرت خدا کی طرف سے ہوتی ہے، پھر ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تم اس ملک میں کس لیے آئے؟ تم تو اس لیے آئے تھے کہ اس قوم میں تمہاری محنتوں اور کوششوں سے اولیاء اللہ پیدا ہوں، بڑے بڑے عارف اور امام پیدا ہوں، بڑے بڑے محدث اور مجتہد پیدا ہوں، تم اس لیے کہ جو خدا کا نام نہیں جانتے، خدا کے آستانے پر ان کے سر جھکیں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اور اللہ کی معرفت سے روشن ہوں اور ان کے دماغ اللہ کے لائے ہوئے علوم سے منور ہوں، تم اس لیے یہاں آئے تھے کہ ان غریبوں کو جہنم کی آگ سے بچا کر جنت کی بہاروں، جنت کی رونقوں اور جنت کی نعمتوں کا مستحق بناؤ، تم ان سے فائدہ اٹھانے لگے، بجائے اس کے کہ ان کی جان کو بچاؤ اور ان کی جھولی بھرو، تم ان کی جھولی سے اپنی جھولی بھرنے لگے، تم نے ان کو گاہک بنالیا، حالانکہ تم ان کے مبلغ اور گاہک بنا کر بھیجے گئے تھے، جو شخص استاد بنا کر بھیجا گیا، مدرسہ میں رکھا گیا کہ وہ پڑھائے، مدرس ہے، وہ اپنے طالب علموں کو گاہک سمجھ لے اور کہے

کہ یہ ہمارے لیے کیا لائے ہو؟ ہمیں کیا دیتے ہو؟ ہمیشہ اس کی نظر ان کی جیبوں پر رہے کہ ان میں کیا ہے؟ ان کے ماں باپ کی جیبوں میں کیا ہے کہ ہم نکال لیں۔ کتنی پستی ہے انسانیت کی اور کتنی تذلیل ہے، تم یہاں ان کو گاہک سمجھنے کے لیے نہیں آئے تھے، ان کو دینے کے لیے آئے تھے، تم یہاں ان کو ہدایت کا تحفہ دیتے، نبوت کے علوم عطا کرتے، اللہ تعالیٰ کا راستہ بتاتے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھلوانے کے لیے آئے تھے، مگر تمہیں تجارت سے فرصت نہیں، اپنے مکانوں اور کوٹھیوں سے فرصت کے بنانے سے فرصت نہیں، اپنے کاروبار کے بڑھانے سے فرصت نہیں۔

اللہ نے ہم کو اس زمانے میں پیدا کیا، زمانہ بہت نازک بہت خراب لیکن کرنے والے ہر زمانے میں کرتے رہے ہیں، جب تلوار سر پر لٹک رہی تھی اور کسی کو اپنی جان کا اطمینان نہیں تھا اور کوئی سانس نہیں لے سکتا تھا، پوری دنیائے اسلام میں بڑے بڑے بہادر دبکے پڑے تھے اور بڑے بڑے بادشاہ کونوں میں پڑے ہوئے تھے اور کوئی میدان میں نہیں نکل سکتا تھا، اس وقت اللہ کے بندوں نے نہ صرف یہ کہ دوسروں پر تبلیغ کی بلکہ تاتاریوں تک کو مسلمان کرلیا۔

میرے دوستو اور بزرگو! آج یہ ملک ہمارے تمہارے لیے پڑا ہوا ہے، اللہ کی مخلوقات اور انسانوں کا ایک جنگل ہے جو تمہارے حوالے کیا گیا ہے، تم جو اس ملک میں لائے گئے ہو یقین کرو کہ تم کھانے پینے کے لیے، دکان کرنے کے لیے، تجارتوں کو ترقی دینے کے لیے نہیں آئے، ہرگز نہیں!

اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے، ان نسلوں کا، ان بندوں کا جنہوں نے دنیا میں ہدایت وتبلیغ کا کام کیا تھا اور آج اللہ تعالیٰ نے تم کو اتنا بڑا انسانی کارخانہ عطا فرمایا ہے، تم کو اس ملک کی امامت وہدایت کا کام سونپا گیا ہے، اس میں کروڑوں انسان بستے ہیں، کل آپ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہاں کیا کیا؟ اللہ کے بندوں کو جہنم کے عذاب سے بچانے کے لیے اور اس جہالت اور اس حیوانیت کی زندگی سے نکالنے کے لیے اور اللہ کی روشنی اور ہدایت میں داخل کرنے کے لیے، ان کو جنت کا مستحق بنانے کے لیے، ان پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھولنے کے لیے، ان کو خدا کا بندۂ مقبول بنانے کے لیے اور ان کو دنیا وآخرت کے خطرات سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تم کو اس ملک میں رکھا ہے۔

لیکن آج حالت برعکس ہو رہی ہے، مسلمانوں کی جو قوم ہے اسی کے ایمان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اسی میں ارتداد پھیل رہا ہے۔

میرے دوستو! آپ پر ان برادران وطن کی ذمہ داری بھی ہے جو وہ اور آپ ایک ہی پانی سے پیاس بجھاتے ہیں، ایک ہوا میں سانس لیتے ہیں، ایک زمین پر چلتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو اس ملک رکھا ہے، ایک ایک بندے کے متعلق آپ سے سوال ہوگا، ایک ایک مسلمان سے متعلق اللہ تعالیٰ آپ سے سوال کرے گا کہ ہم نے تمہیں وہاں پیدا کیا تھا، ہم نے تمہیں وہاں بھیجا تھا، ایمان کی دولت نصیب کی تھی، کھانے پینے کے لیے، پیٹ بھرنے تک کا سامان دیا تھا، ہاتھ پاؤں دیے تھے، صحت دی تھی، تندرستی دی تھی، تم نے کیا حق ادا کیا؟

میرے دوستو! یہ تم ایک دارالامتحان میں ہو، تم امتحان گاہ میں ہو، آج تم نہیں سمجھ رہے ہو، لیکن کل روز قیامت جب حضور ﷺ کو کیا منھ دکھاؤ گے، جب تم آپ ﷺ کے سامنے آؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہاری پیشی ہوگی اور اس وقت تمہیں معلوم ہوگا اور تم سے حساب ہوگا اِس وقت کا، اِس جگہ کا اور یہاں کے انسانوں کا، تم سے حساب طلب کیا جائے گا کہ صرف تم اس لیے تھے کہ کارخانہ قائم کرو، آمدنی میں اضافہ کرو اور ہمیں فرصت نہ ہو کسی وقت کمانے سے۔

یہاں جو سب سے بڑی عقل مندی، سب سے زیادہ ضروری اور پہلا کام ہے اور اس وقت جو وقت کا فریضہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں دین کے لیے محنت کرلو، سب سے بڑی یہاں کی سیاست یہی ہے، سب سے بڑی یہاں کی معرفت یہی ہے، سب سے بڑی یہاں کی حکمت یہی ہے، اس ملک میں ایک مرتبہ طے کرلو کہ دس بیس برس اسلام کو پھیلانا ہے اور یہاں کے مسلمانوں کے عقیدے اور اسلام کی حفاظت کرنی ہے۔ (ہدایت وتبلیغ کی اہمیت: ۲۹-۳۷)

مسلمانوں کا تحفظ کیوں اور کیسے؟

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

قوم دو طرح کے اعمال سے بنتی ہے: ایک انفرادی اعمال سے اور دوسرے اجتماعی وسماجی اعمال سے۔

ایک یہ کہ ہم اندر سے خود کیا ہیں؟ اللہ کا ہمارے اندر کتنا خوف ہے؟ ہم اللہ کے حکموں پر کتنا عمل کرتے ہیں؟ فرائض کو ہم کتنا انجام دیتے ہیں؟ ہم میں تقویٰ کتنا ہے؟ ہم اپنی انفرادی عبادت کتنی انجام دیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق کتنا ہے؟ یہ سب انفرادی باتیں ہیں۔

دوسری اجتماعی باتیں ہیں، وہ یہ کہ ہمیں آپس کی زندگی میں اجتماعی کاموں میں جو حسن وخوبی اور اپنے پروردگار کے احکام کی بجا آوری جو انجام دینی چاہیے، وہ ہم کتنا انجام دیتے ہیں؟ یعنی حق کی طرف رہنمائی کرنا، دین پر صحیح طور پر عمل کی دعوت دینا اور لوگوں کو درست کرنے کی کوشش کرنا اور یہ کہ ہماری سوسائٹی اور ہمارا معاشرہ بھی معیاری معاشرہ ہو، اس میں اچھا ماحول بنے، اچھی عادتیں اختیار کی جائیں اور ایک دوسرے کی اصلاح کی اور ایک دوسرے کو غلط راستہ سے بچانے کی فکر ہو اور یہ کام مقامی سطح پر بھی اور عالمی پیمانہ پر کرنا ہے، یہ وہ عظیم کام ہے جس کے کرنے پر اس امت کو سارے انسانوں پر فوقیت دی گئی ہے، سارے انسانوں کے ساتھ اس کو اسی طرح کی خیر خواہی اور خیر پسندی کا رویہ اختیار کرنا پڑے گا اور اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے تو آدمی اپنی ذات سے شروع کرے، پھر اپنے ماحول اور اپنی سوسائٹی سے شروع کرے اور پھر پوری دنیا میں اپنے کام کو پھیلائے اور چونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ یہ امت پوری کی پوری ہلاک نہیں ہوگی، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ اس معیار کو امت کے کچھ نہ کچھ افراد بحال کیے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے امت ٹھہری ہوئی ہے، اگر سبھی اس راستہ سے ہٹ جائیں، جیسے بنی اسرائیل کی اکثریت اس راستہ سے ہٹ گئی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوتی ہے۔

اس وقت جو بھی دین کی خدمت ہو رہی ہے، جو بھی ایسا کام ہو رہا ہے جو اللہ کو پسند ہے، یہ اس کی برکت ہے کہ امت ٹھہری ہوئی ہے اور اس امت کو مصائب اس طرح پیش نہیں آرہے ہیں جس طرح پیش آنے کا خطرہ ہوسکتا ہے، لیکن جہاں غفلت ہوگی وہاں پھر وہ حالات بھی خراب ہوں گے جو دنیاوی حالات کہلاتے ہیں، دنیاوی حالات دینی حالات کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اس کو اس طرح سمجھئے کہ اگر درخت کی جڑیں صحیح ہیں تو درخت پھولے گا، پھلے گا اور اس میں اچھا پھل آئے گا اور اگر جڑوں میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تو اوپر پھل بھی خراب ہوگا، ہم صرف اوپر کو دیکھتے ہیں، نیچے کو نہیں دیکھتے، ہم باہر کو دیکھتے ہیں، اندر کو نہیں دیکھتے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم کو عزت حاصل نہیں، ہم کو وہ حیثیت حاصل نہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے اعمال کیسے ہیں؟ ہماری سیرت کیسی ہے؟ ہمارے اخلاق کیسے ہیں؟ ہمارا معاشرہ کیسا ہے؟ ہم میں کتنی وہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے صرف خلاف ہی نہیں ہیں بلکہ اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں۔

اس وقت جو صورت حال مسلمانوں کی ہے اس کو بہتر بنانے کے لیے اور اپنے تحفظ کے لیے ہم کو دین کے تحفظ کی فکر کرنی ہے، ہم جتنا دین کا اور ان تعلیمات کا تحفظ کریں گے جو ہم کو دی گئی ہیں، اتنا ہی اس دنیا میں بھی ہمارا تحفظ ہوگا اور ہم کو وہ عزت حاصل ہوگی جس عزت کے ہم طالب ہیں اور صرف یہ وعظ نہیں ہے بلکہ ایک جائزہ ہے، مسلمانوں کی تاریخ کا اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا، اس کی

مثالیں قرآن مجید میں بھی ذکر کی گئی ہیں، اس جائزے سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہیے، ہم کو یہ چاہیے کہ ہم اپنی سوسائٹی کو درست کریں، اپنے اخلاق کو درست کریں اور اس راستے کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرنے کی کوشش کریں، جس راستہ سے ایک مسلمان کو عزت حاصل ہوتی ہے اور مقام حاصل ہوتا ہے۔ ہم کافروں کو دیکھتے ہیں، دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو یہ اعزاز حاصل ہے تو بعض وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم تو اسلام پر عمل کرنے والے ہیں، ہم اللہ اور اس کے رسول کو ماننے والے ہیں، ہم کو یہ مقام، یہ عزت حاصل نہیں اور کافروں کو حاصل ہے، تو بھائی! کافروں کو جو حاصل ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق صاف صاف یہ کہا ہے کہ اس کی اہمیت نہ سمجھو کہ کافروں کو عزت و شوکت حاصل ہے، ان کو دولت حاصل ہے، یہ صرف ان کی اسی دنیا کا فائدہ ہے، یہ صرف اسی حد تک ہے، جب تک ان کو موت نہیں آتی تب تک یہ فائدہ اٹھانے والے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو اس کی زندگی کے صرف چند سال کا فائدہ ہے، پھر بعد میں پکڑ اور سزا ہی سزا ہے، تو کیا فائدہ ہے؟ قیامت کے بعد جب یہ زندگی ختم ہوگی تو ان کو کچھ نہیں ملے گا، اس لیے ان پر رشک نہ کرو، رشک کرنے کی بات یہ ہے کہ دوسری زندگی میں جو آخرت کی زندگی ہے اس میں ہم کو کیا ملے گا؟ جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے، جس کو سال اور دن کے لحاظ سے کوئی شمار نہیں کر سکتا، اس زندگی میں ہم کو کیا ملے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ یہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر ان کا حال درست ہو تو اس زندگی میں بھی دیتا ہے اور اس زندگی میں بھرپور دیتا ہے، دنیاوی زندگی میں بقدرِ ضرورت دیتا ہے اور اصل وہاں دیتا ہے جو آخرت میں ملنے والا ہے اور کافروں کو تو یہ ہے کہ ان کو جو بھی ملتا ہے صرف اسی چند روزہ زندگی میں ملتا ہے اور ایک جگہ تو اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اگر اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ مسلمان کافروں کی دولت دیکھ کر بہک جائیں گے تو ہم کافروں کو ایسے ایسے محل دیتے کہ وہ سونے چاندی کے محل ہوتے، اس کے زینے اور راستے سونے اور چاندی کے ہوتے کہ مزہ اڑالیں:

﴿وَلَوْلَا أَن يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفاً مِّن فَضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ☆ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَاباً وَسُرُراً عَلَيْهَا يَتَّكِؤُونَ☆وَزُخْرُفاً وَإِن كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ﴾

(الزخرف: ۳۳-۳۵)

(اور اگر یہ (خیال) نہ ہوتا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت (کفر) پر آجائیں گے تو ہم ضرور رحمٰن کا انکار کرنے والوں کے لیے ان کے گھروں کی چھتوں کو چاندی کا کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھا کرتے ہیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور مسہریاں جن پر وہ ٹیک لگاتے ہیں اور سونے کا کر دیتے جبکہ یہ سب کچھ نہیں بس صرف دنیا کی زندگی کے سامان ہیں اور آپ کے رب کے نزدیک آخرت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔)

ان کو کچھ زیادہ ملتا ہے، تو ان کو صرف دنیا کے لیے محنت کرنے پر صرف دنیا تک کے لیے ملتا ہے، یہ صرف چند برسوں کا مزہ ہے، اس سے زیادہ ان بے چاروں کو ملنا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کافروں کو اتنا نہیں دے رہے ہیں کہ اس کو دیکھ کر مسلمان بہک جائیں، ورنہ یہ چیزیں اصلاً مسلمانوں کو آخرت میں ملنے والی ہیں، اگرچہ اس دنیا کے اندر بھی اللہ تعالیٰ ان کو راحت عطا فرمائے گا، ان کی ضرورت کے مطابق ان کو عطا فرمائے گا، لیکن یہ اس وقت ہے جب ہم اللہ کو راضی کرنے کی زندگی اختیار کریں گے، ورنہ پھر وہی معاملہ ہوگا جو دوسری قوموں کے ساتھ ہوا ہے۔

ہمیں اس کی فکر کرنی ہے اور ہمیں اپنے کو بھی درست کرنا چاہیے اور اپنے معاشرے کو بھی اور یہ کہ ہم کو داعی بننا چاہیے تاکہ ہم اپنی ذمہ داری انجام دینے میں سرخ رو ہوں اور قیامت میں دوسری امتوں کے لیے گواہ بننے کے قابل بھی ہو سکیں۔

(حالاتِ حاضرہ اور مسلمان: ۲۶-۳۳)

خواتین کے تحفظ کا اسلامی طریقہ

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

پردہ سے چڑھنا اس کے نام سے نفرت کرنا، اس کو عورت کے لیے غلامی کی زنجیر قرار دینا، یہ اس بیمار ذہنیت، عیاش طبیعت اور شیطانی مزاج کی علامت ہے جو مغربی دنیا کے حکمراں طبقہ میں عام ہے۔

عورت کو رسوا کرنے والے عناصر ہر دور میں رہے ہیں، آج سے چودہ سو سال پہلے جب نہ تو تعلیم کا رواج تھا، نہ ملازمتوں کا چلن تھا، نہ شیشہ کی دیواروں سے بنے اور مخملی پردوں سے آراستہ آفیسرز تھے کہ ان کے شایان شان کسی خاتون سکریٹری کی ضرورت پڑے، نہ بلند و بالا ٹاوروں میں ایسے شاپنگ سنٹر تھے کہ ان کی رونق بڑھانے کے لیے حسن و رعنائی سے بھرپور سیلس گرل کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑے، نہ ایسی ملٹی نیشنل کمپنیاں تھیں کہ ان کو اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے کسی پرکشش نسوانی چہرہ کا سہارا لینا پڑے، لیکن پردہ کی مخالفت اس وقت بھی ہوئی اور شاید آج سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوئی، کیوں کہ پردہ کی مخالفت کے اسباب کچھ اور ہی تھے، وہ دل کا ایک روگ تھا اور آنکھوں کی ایک ہوس تھی جو عورت کے چہرہ پر نقاب دیکھنے کی روادار نہ تھی۔

آج سے چودہ سو سال پہلے مدینہ منورہ میں جہاں مسلمانوں اور یہودیوں کی مشترک آبادی تھی، قریب قریب مکانات تھے، ایک دوسرے سے معاملات پڑتے تھے، خرید و فروخت کے مواقع پر آمنا سامنا ہوتا تھا، جب پردہ کا حکم نازل ہوا تو یہودیوں کے ناپاک خیالات پر ایک کاری ضرب لگی، تفریح اور لطف اندوزی کے مواقع ان کو ہاتھ سے نکلتے محسوس ہوئے، کل تک پاک باز و عفت مآب خواتین کے چہروں پر ناپاک نگاہ ڈال کر ان کے دل میں چھپے جس شیطان کی باچھیں کھل جایا کرتی تھیں، آج اس شیطان کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا، لیکن شیطان شیطان ہے، کیسے مر سکتا تھا اور کیسے اپنی حرکت سے باز آسکتا تھا؟

بنو قینقاع کے یہودیوں کے بازار میں ایک پردہ نشین مسلم خاتون کا ایک یہودی سنار کی دکان پر آنا ہوا، خاتون کے چہرہ پر پڑی نقاب کو دیکھ کر بازار میں موجود یہودیوں کو سخت ناگواری ہوئی، اسلام کی آمد سے پہلے اس معاشرہ میں یہودیوں کو پوری آزادی حاصل تھی، کوئی پردہ نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں اور ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں، چنانچہ عادت کے مطابق انہوں نے ان باعزت پردہ نشین خاتون سے چہرہ کھولنے کی فرمائش ظاہر کی، ان کا یہ مطالبہ جب پورا نہ ہوا تو ان کا خون کھول گیا، آخر کار انہوں نے حرکت یہ کی کہ ان خاتون کو غافل پا کر ان کے دوپٹہ کا وہ سرا جو ان کی کمر سے پر لٹک رہا تھا ان کے پچھلے دامن میں باندھ دیا، سامان خرید کر تیزی کے ساتھ وہ خاتون جب اٹھیں تو دوپٹہ کے کھنچاؤ سے ان کا دامن بھی اٹھ گیا، جسم کا کھلنا تھا کہ یہودی شیطانوں نے ایک قہقہہ لگایا اور شرم و حیا کی اس دیوی کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی، قریب ہی ایک دکان میں ایک غیرت مند مسلم نوجوان کھڑا تھا، لمحہ بھی نہیں گزرا کہ اس کے نیام سے تلوار باہر آئی، لہرائی، چمکی اور اس یہودی سنار کے سر کو تن سے جدا کر گئی، بازار میں موجود تمام یہودی اس نوجوان پر ٹوٹ پڑے، لڑتے لڑتے آخر کار وہ نوجوان شہید ہو گیا، حضور ﷺ کو جب یہودیوں کے ہاتھوں ایک مسلم خاتون کی اہانت کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا، یہاں تک کہ انہوں نے آپ ﷺ کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

یہ تھا پہلا واقعہ پردہ کی مخالفت کا اور یہ تھی وہ حقیقت جو پردہ کی مخالفت کے پیچھے کارفرما تھی اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے،

شکلیں بدل گئیں، انداز بدل گیا، عناوین بدل گئے، لیکن سبب وہی ہے اور مقصد بھی وہی۔

لیکن کیا عورتوں پر اس پروپیگنڈہ کا اثر پڑ رہا ہے؟ کیا خواتین اس فریب کا شکار ہو رہی ہیں اور آزادی کے نام پر مردوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال رہی ہیں؟ اس کا جواب ہمیں ایک خبر کی اس سرخی سے مل جاتا ہے کہ ''فرانس میں سالانہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد دس ہزار پہنچ چکی ہے۔'' خبر کے نیچے تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، خبر کی سرخی ہی کافی ہے، لیکن یہاں اتنا بتانا ضروری ہے کہ خبر کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مغربی ممالک میں تعلیم یافتہ خواتین ان نعروں کی حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہیں، آزادی، عریانیت اور فحاشی کے بھیانک نتائج دیکھ کر وہ اسلام کی چہار دیواری میں آکر زندگی اور اپنا مستقبل محفوظ رکھنا چاہتی ہیں، تبھی تو مغربی خواتین کے اسلام قبول کرنے کے واقعات اتنی تیزی سے سامنے آرہے ہیں۔

بے پردہ خواتین میں پردہ کا رواج اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ پردہ کے مخالفین کی نیندیں حرام ہوتی جارہی ہیں، فلمی ایکٹرس، ماڈلس، گلوکاراؤں اور نائٹ کلبوں میں رقص وسرور کی محفلیں سجانے والی خواتین کے تائب ہونے اور شرعی اصول وضوابط کے مطابق زندگی گزارنے کی خبریں آئے دن اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ یہاں مشرق کے مسلم نوجوان تعلیم یا ملازمت کی خاطر مشرق کی سرحد پار کر کے جب مغرب کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے چہرے داڑھی سے صاف ہوتے ہیں، لیکن جب یہی نوجوان مغربی ماحول میں ایک دو سال چھٹیاں منانے کے لیے اپنے وطن لوٹتے ہیں تو ان کے چہروں پر گھنی اور لمبی داڑھی دیکھ کر ان کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے اور قرآن کریم کی اس آیت ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (الصف:۸) (یہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانے چلے ہیں اور اللہ کو تو اپنا ''نور'' (ہدایت کی روشنی) مکمل کر کے رہنا ہے، خواہ ان کافروں کو کیسا ہی ناگوار گذرے) پر یقین اور بڑھ جاتا ہے۔

اسی طرح وہ خواتین جو یہاں پردہ کے نام سے چڑھتی تھیں اور پردہ کی تلقین کرنے والی خاندان کی بڑی بوڑھی عورتوں کا کھلم کھلا مذاق اڑاتی تھیں، حتی کہ ان کے ساتھ چلنے پھرنے کو اپنے لیے باعث عار سمجھتی تھیں، وہی خواتین یورپ جا کر جب واپس آتی ہیں تو ان کے چہرے پر پردہ کا نور ہوتا ہے اور ان کے ہر ہر عمل سے اپنے پردے پر فخر کا اظہار ہو رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف پردہ نہ کرنے، مختصر اور تنگ لباس زیب تن کرنے کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ بھی بے پردہ خواتین کے لیے ایک مسئلہ بنے ہوئے ہیں، مغرب کی نقالی نے ان کو اس جگہ پہنچا دیا ہے جہاں ان کا وجود ہی خطرہ میں نظر آنے لگا ہے اور اگر ان کا وجود باقی رہا بھی تو پرانے زمانہ کے ان غلاموں کی طرح ہوگا جن کو سانس لینے کے لیے بھی اپنے آقا کے اشارہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا، کچھ اسی طرح کی حالت آج مردوں نے خواتین کی بنا دی ہے۔

کچھ عرصہ قبل مصر میں ایک فلم ریلیز ہوئی تھی، فلم کی کہانی عوامی جگہوں پر نوجوان عورتوں کے ساتھ پیش آنے والے توہین آمیز واقعات پر مشتمل ہے، جیسے ان کے گلے سے سونے کی چین کھینچ لینا، جلتی سگریٹ ان کی طرف اچھال دینا، گندے فقرے ان پر چست کرنا، ناشائستہ حرکتیں کر کے ان کی دل آزاری کرنا، سرعام ان کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا اور احتجاج کرنے پر ان کو گالیاں بکنا اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے غصہ دکھانا اور ستم بلائے ستم یہ کہ وہاں موجود دوسرے مردوں کا کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنا بلکہ عورتوں اور ان کی بے جا فیشن پرستی کو مورد الزام قرار دینا۔

بے پردہ خواتین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی یہ چند مہذب قسمیں ہیں، رہیں غیر مہذب قسمیں تو ان کی فہرست بہت طویل ہے اور ان کی تفصیلات میں جانا بھی غیر مہذب ہونے کی دلیل ہے۔

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دنیا کی مثال:

دیکھا جائے تو یہ دنیا برتنے کے اعتبار سے بالکل مٹھائی کی طرح ہے، آدمی مٹھائی کھاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی اعلیٰ قسم کی مٹھائی ہو، تو شروع میں بڑی خوش ذائقہ معلوم ہوتی ہے، لیکن جب وہ حلق سے اتر جاتی ہے تو وہی ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ میٹھا کھانے کے بعد منھ کا مزہ عجیب سا ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح دنیا کا معاملہ ہے کہ جب آدمی اس کو برتتا ہے تو ابتداء میں وہ بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن تھوڑا ہی وقت گذرنے کے بعد اس کی حقیقت اس کے سمجھ میں آجاتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت جتنے بڑے بڑے ساہوکار اور سیٹھ ہیں اور بڑے بڑے پیسے والے لوگ ہیں، جن کے پاس بہت بڑے بڑے مکانات ہیں، دسیوں فلیٹس ہیں، دسیوں گاڑیاں ہیں اور ان کے پاس دنیا کی ساری سہولتیں ہیں، میں اگر قسم کھا کر کہوں تو حانث نہیں ہوں گا کہ وہ اپنی اس دنیا سے پریشان ہیں۔ اگر کوئی آدمی ان سے جا کر پوچھے تو وہ بتائیں گے کہ وہ اس طرز زندگی سے کس قدر عاجز آچکے ہیں۔

حدیث میں آپ ﷺ نے دنیا کی مثال یہ بیان کی ہے کہ

"إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ."

(دنیا میٹھی اور سبز ہے یعنی دنیا بڑی پیاری اور پرکشش ہے)

واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دنیا کی یہ جو مثال بیان فرمائی کہ یہ دنیا میٹھی اور سرسبز ہے، یہ بالکل اپنی جگہ پر سو فیصد صحیح اور Prefect مثال ہے جو اس پر پوری طرح سے منطبق ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا دور سے ہری نظر آتی ہے اور بڑی اچھی لگتی ہے، لیکن جب آدمی اس کو برتتا ہے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اس دنیا میں کیا مزہ تھا اور اس کے اندر کیا مصائب ومشکلات تھیں اور کیسی کیسی اس کے اندر فکریں تھیں اور اس نے ہمیں کیسی کیسی مصیبت میں ڈال دیا؟ اس وقت آدمی کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے پچاس لاکھ تو کما لیے، مگر اتنے کما کر بھی ہمیں وہ سکون نہ ملا جو سکون ہمیں دو چار ہزار میں مل رہا تھا۔ انسانی سماج میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی اپنی حیثیت سے اونچے انسان کو دیکھ حسرت کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے، اس کی تو پچاس ہزار یا ایک لاکھ تنخواہ ہے، اس کو تو بہت مزہ آتا ہوگا، اس کے کیا کہنے؟! لیکن اس کی حقیقت یہ ہے کہ بس دور کے ڈھول سہانے۔ جب آدمی کو خود پیسہ ملتا ہے تب اس کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دنیا میں کتنا مزہ تھا اور کتنی سزا۔

آپ ﷺ نے ایک مثال کے ذریعہ سے اس دنیا کی حقیقت کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ یہ دنیا گویا مٹھائی اور سبزے کی طرح ہے، جس طرح مٹھائی حلق کے اندر جاتی ہے اور اس کا ذائقہ ختم ہو جاتا ہے اور جس طرح سبزہ یا غلہ وغیرہ کھیت میں پک کر تیار ہوتا ہے، پھر جب اس کے کٹنے کا وقت آتا ہے تو وہ بھوسا بھوسا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ گرمیوں کے موسم میں لہلہاتی گھاس وغیرہ بھی خشک ہو جاتی ہے، بالکل یہی معاملہ دنیا کا بھی ہے کہ اس میں ذرا بھی دوام نہیں، اس لیے دھوکہ میں مت پڑ جانا۔ ظاہری طور پر اس دنیا کی رعنائی کا حال دور سے نظر آنے والے سبزہ زار باغ کے جیسا ہے، جو دور سے بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے، لیکن جب اس کے قریب پہنچو تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے اندر کنکر و پتھر بھی ہیں اور جگہ جگہ گندگی بھی ہے۔ اسی لیے جب آدمی دنیاداری میں گھستا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور سے جتنی حسین معلوم ہوتی تھی، حقیقت میں معاملہ اس کے بالکل

برعکس ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں کچھ مزے کی چیزیں ہوتی ہیں جن کو آدمی حاصل کر لیتا ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ جو اس کی مصیبتیں ہیں اس کا کوئی حساب وکتاب نہیں۔

دنیا-دار الامتحان

حدیث میں آتا ہے کہ

"إِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا، فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ."

(اللہ تم کو اس میں جانشیں بنائے گا اور دیکھے گا تم کیسے عمل کرتے ہو؟)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجا اور ان کو اپنا خلیفہ بنایا، پھر انہی کے واسطے سے تمام انسانوں کو دنیا میں پھیلا دیا اور ان کی اولاد کو بھی اللہ نے خلیفہ قرار دیا، گویا سب کے سب خلیفہ ہیں۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ تمہیں اس دنیا میں اس لیے بھیج رہا ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ آدمی اس دنیا کو کس طرح سے برتتا ہے، گویا اس دنیا میں اللہ نے انسان کو آزمائش کے لیے بھیجا ہے، اسی لیے اس نے انسان کی چاہت اور اس کی آرائش وزیبائش کی چیزیں اس دنیا میں بکھیر دی ہیں، تاکہ وہ یہ آزمائے کہ انسان دنیا میں کس طرح زندگی گذارتا ہے؟ کیا چیزیں اختیار کرتا ہے اور کن چیزوں سے بچتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حدود متعین کر دیئے ہیں اور گویا ایک لائن کھینچ دی ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کرنا ہے۔ارشاد ہے:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾(الأعراف: ۳۱)

(کھاؤ اور پیو اور زیادتی مت کرو۔)

معلوم ہوا آدمی کو دنیا میں کھانے پینے کی اجازت تو ہے، لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ تجاوز نہ ہو، یعنی مال حرام نہ ہو، مشتبہ نہ ہو، کسی دوسرے کا ناحق لیا ہوا نہ ہو، حرام کمائی کا نہ ہو بلکہ حلال کمائی کا ہو، اگر ان ساری شرطوں کے ساتھ ہے تو پھر کھانے اجازت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دنیا اور اس کی زندگی ہمیں امتحان کے لیے دی ہے، اس لیے نہیں دی کہ آدمی اس میں پوری طرح سے گھس جائے اور پھر جو سمجھ میں آئے وہ کرتا چلا جائے، نہ حلال دیکھے نہ حرام، نہ جائز دیکھے نہ ناجائز، بلکہ جو سمجھ میں آئے وہ کرتا چلا جائے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں آدمی دھوکہ میں پڑ جاتا ہے اور جب اس کو مزہ آنے لگتا ہے تو وہ بھول جاتا ہے کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے؟ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس کا مزہ بہت مختصر ہے، جیسا کہ حدیث میں مثال دی گئی، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کا مزہ بہت ہی فانی اور عارضی مزہ ہے، گویا تھوڑی دیر کا مزہ ہوتا ہے اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں، بلکہ بعض مرتبہ وہ مزہ ایسا ختم ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح کی چھوٹی موٹی سزا ہی بن جاتی ہے۔

انسان کی ہوس

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کو آزمائش کے لیے بنایا ہے، اسی لیے یہ حقیقت ہے کہ جو آدمی ایک مرتبہ اس کے جال میں پھنستا ہے تو وہ پھنستا ہی چلا جاتا ہے، مثل مشہور ہے کہ "آدمی ننانوے کے پھیر میں پھنستا چلا جاتا ہے۔" اسی لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلے ہم کما لیں پھر دین کی خدمت کریں گے، تاکہ کام کرنے میں آسانی ہو، تو عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ کمائی کے دھندے میں پھنستے ہیں تو ایسا پھنس جاتے ہیں کہ انہیں دین کی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کمانے سے آدمی کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، ایسے لوگ جب ایک مکان بنالیں گے تو سوچیں گے کہ ایک اور مکان بنا کر کرایہ پر اٹھا دیں، جب وہ بنالیا تو کہتے ہیں دو چار اور بنالیں، اس لیے کہ اتنے میں آمدنی پوری نہیں ہوتی، جب وہ بھی بن گیا تو خیال ہوا کہ یہ بھی کم ہے، مناسب یہ ہے کہ اب ایک ٹاور بنا دیا جائے تاکہ دین کی خدمت کا اچھا موقع مل سکے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو دین کی خدمت کا موقع کبھی ملتا ہی نہیں۔

طلاق کے چند مسائل

مفتی راشد حسین ندوی

حلالہ کیا ہے؟

اسلام دشمن لابی کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کی جن چیزوں پر تنقید کی جاتی ہے، بلکہ مذاق اڑایا جاتا ہے، ان میں سے ایک اہم چیز ''حلالہ'' بھی ہے، لیکن آپ کو یہ جان کر شاید حیرانی ہوگی کہ کتاب وسنت میں ''حلالہ'' کے نام سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے، اسلام نے عورت کی عزت ووقار کو قائم رکھنے کے لیے تین طلاق دینے والے شوہر کی ایک سزا مقرر کی ہے، تاکہ طلاق کو مذاق سمجھنے کی غلطی وہ نہ کرے، اس سزا سے بچنے کے لیے کچھ جاہل مسلمانوں نے ''حلالہ'' کے نام سے ایک گھناؤنے طریقہ کو اپنا رکھا ہے، جس کا کتاب وسنت اور اسلامی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام پر تنقید کرنے والے ان خود ساختہ ''احکام اسلامی کے ماہرین'' کا علمی پایہ کیا ہے؟ درحقیقت اس طرح کے اسلام دشمن عناصر والٹس ایپ یونیورسٹی کے بھی کمزور ترین اسٹوڈنٹ ہیں، جو اسلام اور مسلم دشمنی میں اسلام پر خود ایک چیز تھوپتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ اس عمل سے خود ان کی پول کھل جاتی ہے اور حقیقت جان لینے والا خود ان پر قہقہے لگاتا ہے۔

حلالہ ایک سزا ہے:

جاہلیت میں ایک برا رواج یہ تھا کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تھا، تو وہ جب چاہے اس سے رجوع کا حق دار رہتا تھا، خواہ کتنی بھی طلاقیں نہ دیدے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ﴾ (البقرة: ۲۲۸)

(اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین دور تک انتظار کریں اور ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو چیز پیدا کی ہو اس کو وہ چھپائیں۔)

اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرد جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تھا، تو وہ اس سے رجوع کرنے کا اختیار رکھتا تھا، اگرچہ وہ اس کو تین طلاق دیدے، تو اس کو منسوخ کر دیا گیا اور اللہ نے فرمایا:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ (إلیٰ) ﴿فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ (البقرة: ۲۲۹-۲۳۰)

(طلاق تو دو ہی ہے کہ اس میں یا تو دستور کے موافق روک لے یا سلوک کر کے رخصت کر دے (الیٰ) پھر اگر وہ اس کو تیسری طلاق دیدے تو اس کے بعد وہ عورت اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے تعلق نکاح قائم نہیں کر لیتی۔) (أبو داؤد، کتاب الطلاق، باب نسخ المراجعة بعد ثلاث تطلیقات: ۲۱۹۵)

اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ''الطلاق مرتان'' کی تفسیر کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تم کو طلاق دیا کروں گا، پھر جب عدت ختم ہونے کو ہوگی تو رجوع کر لیا کروں گا، اس طرح نہ میں خود زوجیت کے حقوق دوں گا، نہ تمہیں دوسرے سے شادی کرنے دوں گا، تو اس طرح کا ظلم روکنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی اور شوہر کو صرف دو

طلاقوں تک رجوع کا اختیار دیا گیا، تیسری طلاق کے بعد یہ حق چھین لیا گیا، تاکہ نعمت کی ناقدری کی اس کو صحیح صحیح سزا مل سکے اور بیوی دوسرے شوہر کے ساتھ سکون کی زندگی گذار سکے، البتہ اگر دوسرا شوہر زوجیت کے حقوق ادا کرنے کے بعد طلاق دیدے یا مرجائے تو عدت گذارنے کے بعد وہ چاہے تو پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے، اس سے پہلے اس کی گنجائش نہیں ہے، اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ تین طلاق دینے کے بعد دوسرے سے صرف اس مقصد سے نکاح کرے تاکہ وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہوسکے۔

طے کرکے حلالہ کرنا قابل لعنت ہے:

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”لعن اللّٰه المحلل والمحلل له.“(أبو داؤد، کتاب النکاح، باب فی التحلیل: ۲۰۷۷، ترمذی، أبواب النکاح، باب ما جاء فی المحلل والمحلل له: ۱۱۱۹، ابن ماجة، کتاب النکاح، باب المحلل والمحلل له: ۱۹۳۵)

(پہلے شوہر کے لیے حلال کرنے کی غرض سے نکاح کرنے والے شخص اور پہلے شوہر دونوں پر اللہ کی لعنت ہو۔)

اسی لیے فقہاء میں سے امام ابویوسف نے فرمایا کہ اس طرح طے کرکے نکاح کیا جائے تو فاسد ہوگا، اس لیے کہ نکاح موقت باطل ہوتا ہے اور یہ اسی کے معنی میں ہے اور امام محمد نے فرمایا کہ نکاح ہوجائے گا، لیکن اس طرح طے کرکے نکاح کرے تو عورت پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ حلال تو ہوجائے گی لیکن ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہوگا اور طے ہونے کے باوجود دوسرے شوہر کو طلاق دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(شامی:۲/۵۸۶-۵۸۷)

البتہ سب کے نزدیک اگر طے کیے بغیر نکاح کرے اور اس کے دل میں یہ خیال ہو کہ طلاق دے دیں گے تاکہ اس شخص کا گھر بس جائے تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہوگی، بلکہ امید ہے کہ اس کو حسن نیت کی وجہ سے ثواب ملے گا۔(شامی:۲/۵۸۷)

دوسرے شوہر کا خاص تعلق قائم کرنا شرط ہے:

یہ واضح رہے کہ شوہر جب اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے، خواہ وہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ، تو جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ قرآن مجید میں صراحت سے آیا ہے کہ جب تک شرعی طور سے حلالہ نہ ہوجائے، یعنی طلاق کے بعد اگر مدخولہ عورت ہے تو اپنی عدت پوری کرے، پھر کسی شخص سے ہمیشہ رہنے کے لیے نکاح کرے اور وہ شخص ہم بستری کے بعد کسی وجہ سے اس کو طلاق دیدے یا مرجائے، تو جب یہ عدت گذر جائے تو اب پہلا شوہر اگر اس عورت کی رضامندی ہو تو اس سے نکاح کرسکتا ہے، لیکن اگر دوسرا شوہر ہم بستری سے پہلے مرگیا، یا ہم بستری سے پہلے اس نے طلاق دیدی، تو پہلا شوہر اس سے نکاح نہیں کرسکتا ہے، اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، اس لیے کہ حدیث شریف میں صاف طور سے اس حکم کو بیان کیا گیا ہے:

”عن عائشة رضي اللّٰه عنها (إلیٰ) لا حتی یذوق عسیلتك.“ الحدیث (بخاری، کتاب الطلاق، باب من أجاز طلاق الثلاث: ۵۲۶۰، مسلم، کتاب النکاح، باب لا تحل المطلقة ثلاثاً حتی تنکح زوجاً غیره: ۱۴۳۳)

یہ بھی خیال رہے کہ دوسرے شوہر کا ہم بستری کرنا شرط ہے، لیکن انزال ہونا شرط نہیں ہے۔(ہندیہ:۱/۴۷۳)

لہٰذا اگر نرودھ جیسی کسی چیز کے ساتھ ہم بستری کرلے یا عزل کرلے تب بھی عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوجائے گی۔

(ہندیہ:۱/۴۷۳)

اگر دس بارہ سال کے ایسے بچے سے حلالہ کرایا گیا جو جماع پر قادر ہے، یا مجنون سے حلالہ کرایا گیا تو جائز ہے، لیکن مجنون کی طلاق معتبر نہیں اور بچہ بھی جب تک بالغ نہ ہوجائے، اس کی طلاق معتبر نہیں ہوگی۔(شامی، کتاب الطلاق، باب الرجعة: ۲/۵۸۴، ہندیہ:۱/۴۷۳)

”کیوں ہر طرف تو خوار ہوا احتساب کر“

مولانا محمد طاہر ندوی

غالباً مذاہب کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ زنا ”سیکس“ کو قانونی جواز مل گیا ہے، یہ ایک بڑا انقلاب ہے، یہی موجودہ کلچر کی اساس ہے، اسی چیز نے تہذیبی ارتداد کی راہ ہموار کی ہے، پہلے ہر مذہب ہر مہذب سماج اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جو چیز کبھی گناہ اور جرم مانی جاتی تھی آج عین آزادی اور معیار ثقافت ہے۔

الحمد للہ ”اہل ایمان“ اب بھی محفوظ ہیں اور آزادانہ سیکس کو عورت، خاندانی استحکام اور سماجی وحدت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

ارتداد کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، جب سے نام نہاد جدیدیت ”موڈرنیٹی“ ہمارے گھروں میں داخل ہوئی ہے، ساتھ ساتھ تہذیبی ارتداد، بے راہ روی نے بھی پنجے جمائے ہیں۔ سماج کے کمیونل ہونے کی وجہ سے یہ بے راہ روی اب زیادہ محسوس کی جانے لگی ہے، لوگ سوشیل میڈیا پر آنکڑے دینے لگے ہیں۔

نوجوانوں میں ارتداد، بے راہ روی کوئی حیرت کی چیز نہیں ہے، یہ تو نتیجہ ہے موجودہ طرز زندگی کا جس نے آزادانہ سیکس کے لیے راہ ہموار کی ہے، پھر اس کو منصوبہ بندی کے ساتھ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ کلچر باور کرایا گیا، تاکہ آزادی کے نام پر جنسی استحصال میں حائل تمام رکاوٹیں دور کردی جائیں، جس پر دین اور سماج نے روک لگائی ہوئی تھی، چنانچہ وہ رکاوٹیں دور ہوتی جارہی ہیں ؎

”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا“

جنسی استحصال اور بے راہ روی کا شکار مسلم لڑکیاں ہی نہیں ہیں، یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے، مسلم لڑکیوں سے زیادہ غیر مسلم لڑکیاں اس کلچر کی زد میں ہیں، چونکہ مسلمانوں کے لیے یہ دین وایمان کا مسئلہ ہے اس لیے ان کے لیے یہ مسئلہ زیادہ حساس اور فکر مندی کا باعث ہے۔ اس بے راہ روی کے قصوروار اور براہ راست ذمہ دار بلکہ مجرم صرف ماں باپ اور سرپرست ہیں، تین چار سال کی جو بچی اس کلچر کے حوالہ کردی جائے، کیا اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑے ہوکر محفوظ رہے گی، نہ وہ دینی ماحول سے گزری، نہ دین کی ابجد سے واقف۔

مسئلہ صرف کالج یونیورسٹی کی لڑکیوں کا ہی نہیں ہے، استحصال کا شکار زیادہ تر لڑکیاں وہ ہیں جو تعلیم یافتہ نہیں ہیں، حتی کہ وہ بھی ہیں جنہوں نے دینی ماحول میں پرورش پائی ہے، آئے دن اس طرح کے دل خراش واقعات رونما ہورہے ہیں، اس کا سبب غالب کلچر اور آزادی کا نام نہاد تصور ہے۔ ”انسان کی فطرت ہے بالادست کی غلامی، زمانہ کے چلن کی پرستاری“ ”الإنسان عبید لمن غلب“

علاوہ ازیں خانگی سماجی روایات کے نام پر عام گھرانوں میں پائی جانے والی جکڑبندیوں سے اباحیت پسندی اور الحاد کو فروغ ملا ہے، نئی نسل خاص طور پر غیر مسلم نوجوانوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر سماج کی اس ظالمانہ سوچ سے آزادی حاصل کی ہے، لوان رلیشن شپ کو نئی طرز زندگی کے طور پر قبول کرلیا ہے۔

مزید برآں اس بے راہ روی کا سبب کہیں برادری کی روایات ”پرمپرائیں“ ہیں، کہیں غربت ہے، کہیں سماجی بندشیں ہیں، کہیں نکاح کی رسومات ہیں، کہیں معاشقہ ہے، کہیں پرموشن، کہیں جاب

ہے، کہیں ''پیسہ کا لالچ''، ارتداد کا بڑا سبب پیسہ کا لالچ ہے اور یہ مہم منصوبہ بند طریقہ سے چل رہی ہے۔

بے راہ روی میں سب سے بڑا رول موبائل، سوشل میڈیا کا غلط استعمال بھی ہے اور یہ ہر نوجوان کی دسترس میں ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ آدھے گھنٹہ کی خانگی تعلیم یا دینی ماحول سے وقتی وابستگی سے صورت حال تبدیل کی جاسکتی ہے خام خیالی ہے۔

اگر کسی لڑکی سے کوئی غلطی سرزد ہوجاتی ہے تو عموماً سرپرست عزت غیرت کا مسئلہ بناتے ہیں، خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے، ارتداد کا فیصلہ ہوجاتا ہے، بائیکاٹ کرتے ہیں، گھر سے دھتکار دی جاتی ہے، کہیں کہیں آنر کلنگ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں، بچیاں اپنوں کے ظلم کا سامنا کرتی ہیں، آخر یہی رویہ خاطی لڑکوں کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا! یہ ایک غیر اخلاقی وغیر اسلامی حرکت ہے، اگر ہم لڑکیوں کے خیر خواہ ہیں، ان کو انحراف سے بچانا چاہتے ہیں تو غیر اخلاقی، غیر اسلامی رویہ میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، یہ اتنا سنگین جرم نہیں ہے کہ خدائی فوج دار بن کر ان کو اتنی سخت سزا دی جائے، یہ صرف گناہ ہے جس کی ذمہ دار وہ خود ہیں، اگر گناہ کا احساس ہو جائے تو انسانیت اور وقت کا تقاضا ہے کہ ایسی متاثرہ خاطی بچیوں سے نفرت نہ کی جائے، گلے لگایا جائے ان کا بھرپور تعاون کیا جائے، ان کو سہارا دیا جائے ان کے گھر بسائے جائیں۔

ہمارے خوبصورت نونہال فکری نفسیاتی طور پر ابنارمل ہورہے ہیں، اپنی تہذیب، زبان و ادب، تاریخ اور پاکیزہ اخلاقی انسانی قدروں کا سینس کھورہے ہیں، قوم اور نئی نسل کے لیے اس سے بڑا سنگین حادثہ نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا گھر گھر بچوں کی زبان، ادب، اخلاقیات کی تعلیم اولین ترجیح تھی۔ لوری، داستان، کہانی، افسانہ، لطیفہ، شعر وشاعری کے ذریعہ بچے زبان وادب سیکھتے تھے، اس طرح بچے اپنی زبان اپنی تہذیب سے آشنا ہوتے تھے، خدا شناسی خود شناسی کا جوہر ان کے اندر پیدا ہوتا تھا، قومی امتیاز، اخلاقی انسانی قدروں کا شعور پروان چڑھتا تھا، اپنی تہذیب پر ان کو اعتماد تھا، ان کے اندر خود اعتمادی ہوا کرتی تھی، ستم ظریفی یہ ہے کہ آج زبان وادب، دین واخلاقیات کے لیے بچوں اور ان کے سرپرستوں کے پاس ٹائم نہیں ہے، خال خال ہی کوئی گھرانہ آداب زندگی کی تعلیم کو اہمیت دیتا ہے، گھر اور اسکول نے اخلاقیات کی تعلیم کو اپنے نظام تعلیم وتربیت سے خارج کر دیا ہے، ''شخصیت سازی'' کا موضوع اب نظام تربیت کا حصہ ہی نہیں رہا، موجودہ نظام حکومت، نظام عدل، نظام تعلیم نے بھی اس غیر فطری کلچر کو قبول کرلیا ہے جس کے سنگین نقصانات سامنے آرہے ہیں، روز بروز ریپ کے کیسوں میں اضافہ ہورہا ہے اور درندگی کے وہ واقعات رونما ہورہے ہیں جو چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

آج احتساب کرنے کا وقت ہے نہ کہ ماتم کا، عورت کی دینی تعلیم کے لیے ہم نے کیا منصوبہ بندی کی ہے؟ پردہ کے نام پر خود ساختہ مذہبیت کے نام پر لڑکیوں کی تعلیم پر عملاً جو پابندی عائد تھی کیا ہٹالی گئی؟ اسی کا خمیازہ آج پورا معاشرہ بھگت رہا ہے، انسان اسی کو تو اپنائے گا جو اس کے سامنے ہے، آج نوجوانوں کے سامنے یہی طرز زندگی ہے تو وہ اس کو ہی تو اپنا رول ماڈل بنائیں گے۔

کیوں ہر طرف تو خوار ہوا احتساب کر
ناراض کیوں ہے تجھ سے خدا احتساب کر
ہر دن کریدتا ہے تو اپنے ہی زخم کو
کیا ہے یہی مرض کی دوا احتساب کر
کب تک رہے گا روشنی کے انتظار میں
جلتا نہیں ہے خود سے دیا احتساب کر
گمنام ہو گیا ہے تو اپنی ہی بزم میں
کن غلطیوں کی ہے یہ سزا احتساب کر

نسخۂ کیمیا

جناب ریاض فردوسی صاحب

ایک وہ وقت تھا کہ مسلمان تعداد کے اعتبار سے بہت کم تھے، مال ودولت سے ان کے ہاتھ خالی تھے، ساز وسامان کا ان کے پاس نام ونشان نہ تھا، اسلحہ اور سامان حرب وضرب کا فقدان تھا اور مادی طاقت وشوکت سے بے بہرہ تھے، لیکن اس کے باوجود وہ قیصر وکسریٰ جیسے عظیم حکمرانوں سے لوہا منوا لیتے اور انہیں سپر انداز ہونے پر مجبور کردیتے تھے۔ وہ دنیا کے جس جس گوشے کی طرف رخ کرتے، فتح ونصرت اور کامیابی وکامرانی ان کے قدم چومتی اور اس دور کی مہذب ترین قومیں انہیں رحمت خداوندی کی نشانی سمجھ کر ان کی راہ میں آنکھیں بچھادیتیں، دنیا لاکھ چاہے لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتی کہ نہایت قلیل مدت میں انہوں نے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اپنی عظمت وسربراہی کے جھنڈے نصب کر دیئے، لیکن آج کلمہ گو مسلمان ہیں کہ بلا استثناء دنیا کے ہر حصہ میں پست وزبوں حال ہیں، حالانکہ اب ان کی تعداد بھی بہت ہے اور مادی وسائل سے بھی وہ اتنے تہی دست نہیں ہیں جتنے ان کے اجداد تھے جن کی بالادستی اور عظمت کو دنیا نے تسلیم کیا تھا اور جنہوں نے کرۂ ارض کی خالی جھولی کو علم ودانش اور تہذیب وشائستگی کی دولت سے بھر دیا تھا۔

آج زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس پر بسنے والے مسلمانوں کے متعلق آئے دن دردناک خبریں سننے میں نہ آتی ہوں، جہاں ان کی زندگی اجیرن نہ ہورہی ہو اور جہاں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے سامان نہ کیے جارہے ہوں۔

ہم اس دردناک حالت پر آنسو بہاتے ہیں، ہم اپنی اس حالت کا الزام تو چیخ چیخ کر اغیار پر رکھتے ہیں اور ہم اس کا ذمہ دار دوسرے کو ٹھہراتے ہیں، لیکن کبھی آئینے میں اپنی شکل نہیں دیکھتے، کبھی اتنا بھی نہیں سوچتے کہ آخر وہ کون سا نسخہ کیمیا تھا جس کے استعمال نے ہمارے موروثوں کو خستہ حالی اور بے مائیگی کے باوجود اتنا سربلند کیا کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور تہذیب وترقی کا کوئی دور ان کی عظمت وبرتری کو بھلا نہیں سکا اور جس کے ترک کردینے سے ہم اس حال کو پہنچ گئے ہیں کہ

پھرتے ہیں میرخوار کوئی پوچھتا نہیں

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول برحق ﷺ کے ذریعے اپنے بندوں سے ارشاد فرمایا تھا:

''اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تمہاری طاقت کمزور ہوجائے گی اور ہوا اُکھڑ جائیگی۔''

اس نسخے میں دوا بھی ہے جو صحت وتوانائی بخشتی ہے اور وہ ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا۔ اگر تم نے اس میں پرہیز کا خیال نہ رکھا (یعنی اتحاد کی رسی کو چھوڑ دیا) اور باہم لڑنے جھگڑنے لگے تو تم لازماً کمزور ہوجاؤ گے اور تمہاری عزت وعظمت خاک ہوجائے گی۔

یہ نسخہ کیمیا کسی خاص زمانے، کسی مخصوص قوم، یا کسی معین ملک کے لیے نہیں ہے، ہمیشہ کے لیے ہے اور ہمیشہ رہے گا، مشرق ومغرب، شمال وجنوب، اقوام وافراد، کالے اور گورے، سب کے لیے یکساں ومؤثر ہے۔ جب تک ہم نے اسے استعمال کیا اور پرہیز کا بھی خیال رکھا، چاردانگ عالم نے ہمارا لوہا مانا اور جب سے ہم نے اس کا استعمال ترک کیا اور جی کھول کر بدپرہیزی کرنے لگے تو ذلتوں اور تباہیوں نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ کوئی ہمارا دشمن نہیں ہے۔ اغیار کا شکوہ لغو اور فضول ہے، ہم خود اپنے دشمن ہیں ہم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ نسخہ اب بھی اپنے تمام تر اثرات کے ساتھ موجود ہے۔ اگر ہم اسے استعمال کرنے لگیں اور پرہیز کا خیال رکھیں، باہمی تنازعات کو ختم کردیں تو یقین کیجیے کہ نتائج اب بھی وہی ہوں گے جو اب سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے ہوئے تھے، سربراہی وسربلندی، علم ودانش اور سائنس وحکمت پر اسی طرح آپ کی اجارہ داری ہوگی۔

مولانا علی میاں ندویؒ اور اہل عرب

محمد ارمغان بدایونی ندوی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اہل عرب سے نسبی وفطری اور روحانی رشتہ تھا۔ حضرت مولاناؒ عنفوان شباب ہی سے اپنے عربی مضامین ومقالات کے ذریعہ ادبائے عرب کے مابین متعارف ہو چکے تھے۔ اسی کے ساتھ خطوط نگاری کے ذریعہ عالم اسلام کے ممتاز ادباء وعلماء سے تبادلہ خیال بھی ہوتا رہتا تھا، مگر جلد ہی حضرت مولاناؒ کو شدت سے یہ خیال ہوا کہ عربی زبان میں ادب وتنقید کے اعلیٰ شاہکار تو بکثرت موجود ہیں لیکن ایسے مضامین کی ندرت ہے جن میں دعوت کی طاقت، دینی جذبہ کا اظہار اور زبان کی روانی ہو۔ اسی لیے حضرت مولاناؒ نے اپنے رواں قلم کو "بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيهَا وَمُرْسَاهَا" کہہ کر متحرک کیا اور بحیثیت داعی مسلمانوں اور بالخصوص اہل عرب کو بلند سطح سے اپنا مخاطب بنایا، جس میں حضرت مولاناؒ نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ بین الاقوامی سطح پر مسلمان تاریخ کے ایک ایکٹر نہیں بلکہ فیکٹر یعنی ایک تاریخ ساز عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولاناؒ نے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" جیسی شاہکار تصنیف لکھی جو بعد میں انکے لیے عرب ممالک میں دعوتی کام کے لیے وزٹنگ کارڈ سے کم ثابت نہ ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں پہلی بار حضرت مولاناؒ نے حج کی نیت سے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب حضرت مولاناؒ نے عالم عربی کے حالات اور وہاں کے تغیرات کو بچشم خود ملاحظہ فرمایا، اس سفر میں کئی عرب علماء سے ملاقاتیں ہوئیں اور تبادلہ خیال بھی رہا۔ اس وقت تک حضرت مولاناؒ کا سب سے پرمغز مقالہ "إلى ممثلي البلاد الإسلامية" تیار ہوا تھا جو حضرت کے ساتھ موجود تھا، حجاز کے پہلے سفر میں یہ رسالہ آپ کا بہترین ترجمان ثابت ہوا۔ "کاروان زندگی" میں ہے:

"مسجد نبوی کے ایک ممتاز استاد حدیث اور نجدی عالم شیخ محمد علی الحرکان نے جو ابوداؤد یا مسلم شریف کا درس دیتے تھے، ایک دن درس روک کر اپنے حلقہ درس میں اس رسالہ کو خود پڑھ کر سنایا۔"
(کاروان زندگی: ۱/ ۳۳۷)

حجاز مقدس سے واپسی کے موقع پر حضرت مولانا کے دل میں شدید داعیہ پیدا ہوا کہ وہ ناصحانہ انداز میں ارکان حکومت کو بتائیں کہ

"اس نے طریق ہدایت کے بجائے طریقہ جبایت (تحصیل وصول اور مالیات) پر چلنا شروع کر دیا ہے اور اس راہ کے اختیار کرنے کے تمام فطری ومنطقی نتائج، دولت ستانی، استحصال، غیر ہمدردانہ اور غیر ذمہ دارانہ روش اور ایمان داری کی کمی کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔" (أیضا: ۱/ ۳۴۰)

حضرت مولاناؒ نے اسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر مستقبل کے بننے والے قائد ولی عہد مملکت امیر سعود کے نام ایک دردانگیز خط لکھا اور ہندوستان روانگی سے قبل اپنے ایک محبّ کے ہاتھ ولی عہد تک پہنچانے کی درخواست کی جو حرف بحرف ولی عہد نے سنا۔

اس سفر سے واپسی کے بعد حضرت مولاناؒ کے دل ودماغ اور اعصاب پر یہ فکر چھا گئی کہ عربوں کو انہی کی زبان میں اسلام کی طرف دعوت دی جانی چاہیے۔ بقول مفکر اسلام حضرت مولاناؒ:

"اسی کو اپنی زندگی کا مقصد وموضوع بنا لینے کا خیال آنے لگا۔"
(أیضا: ۱/ ۳۵۱)

۱۹۵۰ء میں دوسری مرتبہ حضرت رائے پوریؒ کے ساتھ حضرت مولانا کا سفر حج ہوا۔ یہ سفر اہل عرب کے مابین اپنی دعوت وفکر کو پیش کرنے کی شاہ کلید ثابت ہوا جس کے بعد الحمد للہ راستے کھلتے چلے گئے۔ یہی وہ سفر تھا میں جس میں حضرت مولاناؒ کو خانہ کعبہ کی چابی دی گئی اور آپ اپنے شیخ اور دیگر حضرات کے ساتھ داخل کعبہ ہوئے۔ حج کی ادائیگی کے بعد حضرت مولاناؒ دعوتی غرض سے حجاز ہی میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ یہاں کے زمانہ قیام میں حضرت مولاناؒ کی حسبِ منشا ایک ایسی پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں عرب علماء وادباء بھی تشریف فرما ہوں۔ اس محفل میں حضرت

مولاناؒ کی شخصیت تمام حاضرین کے لیے باعثِ توجہ تھی جو محفل دعوت کم، مجلس مناقشہ زیادہ معلوم ہوتی تھی جس میں ہر ایک نے حضرت مولاناؒ کی علمی وادبی لیاقت کا اندازہ کرنے کے لیے مختلف موضوعات پر سوالات کیے مگر حضرت نے پورے تحمل کے ساتھ سب کے جوابات دیے، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ سب حضرت کی شخصیت کے گرویدہ ہوگئے اور انہوں نے سعودی ریڈیو پر حضرت کی تقاریر نشر کرنے کی درخواست کی۔ بظاہر یہ وہ موقع تھا جب حضرت مولاناؒ کو غیب سے اپنی فکر ودعوت کو عام کرنے کا موقع بڑے پیمانہ پر میسر آیا۔

حجاز مقدس میں رہ کر اور یہاں کے نوجوانوں، ادیبوں اور اہل قلم سے ملاقات کے بعد حضرت مولاناؒ اس نتیجہ پر پہنچے کہ

''یہ سب مصری ادیبوں اور وہاں کے اہل علم اور مصنفین کے خوشہ چیں اور زلہ بار ہیں۔'' (أیضا:۱/۳۶۳)

اسی لیے حضرتؒ نے وہیں سے سفر مصر کا ارادہ کرلیا کیونکہ:

''اگر عالم عربی میں کسی چیز کو پھیلانا اور وقیع بنانا ہو اور اس میں کوئی تغیر وانقلاب لانا ہو تو وہ مصر ہی کے راستے سے ممکن ہے۔''

(أیضا:۱/۳۶۴)

مصر میں حضرت مولاناؒ نے تقریباً چھ ماہ قیام فرمایا جس کا مقصد محض وہاں کے لوگوں کا مزاج جاننا اور ان کے درمیان اپنی دعوت وفکر کو عام کرنا تھا۔ حضرت مولاناؒ خود فرماتے ہیں کہ وہاں کی پرتعیش زندگی کے مقابلہ میں ہمارے ظاہری خط وخال سے یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ ہم وہاں کی علمی وادبی فضا سے کچھ دن طالب علمانہ فیض حاصل کر کے واپس آجائیں گے، لیکن الحمد للہ اس وقت حضرت مولانا کی معروف کتاب ماذا خسر مصر میں شائع ہوچکی تھی اور اہل علم وفکر کے مابین متعارف ہوچکی تھی، اس لیے ماذا خسر کے مؤلف کی حیثیت سے مصریوں کی توجہ منعطف کرنا اور بات میں وزن پیدا کرنا آسان ہوسکا۔

اس زمانہ قیام میں چند اہم تقریروں کا بھی ایسا غیبی انتظام ہوا جو مصری ادباء وعلماء کی توجہ حاصل کر لینے کے لیے کافی تھا۔ اسی کے ساتھ طلبائے ازہر سے بھی خاص روابط رہے اور ان کے مابین حضرت مولاناؒ کی مفید ومؤثر مجالس رہیں۔ اسی طرح اخوانیوں کے لیے بھی حضرت مولاناؒ کی شخصیت بڑی محترم رہی اور ان کے درمیان بھی دردانگیز اور فکری خطابات ہوئے۔ اسی سفر میں والی اردن شاہ عبداللہ سے بھی حضرت کی ایک خوش گوار ملاقات ہوئی جو آپ کو مؤلف ماذا خسر کی نسبت سے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔

عالم اسلام کا یہ پہلا دعوتی دورہ حضرت مولاناؒ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا، اس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حضرت کے بڑے بھائی صاحب کے نام ایک مکتوب میں بطور خاص اسکی مبارکباد دی۔

اس کے بعد خط وکتابت اور رسائل وتصنیفات کے اشاعت کا ذریعہ حضرت مولاناؒ کو عالم اسلام سے مربوط کیے رہا اور پانچ سال تک آپ کا سفر نہ ہوسکا۔ مگر ۱۹۵۵ء میں دمشق یونیورسٹی کی کمیٹی نے یہ خط بھیجا کہ ایک یا دو سال کے لیے بحیثیت پروفیسر آپ تشریف لے آئیں۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی مقامی مصروفیات کے پیش نظر یہ مناسب نہ سمجھا لیکن چند دنوں بطور وزٹنگ پروفیسر آنے کی بات کہی جس کو کمیٹی نے بخوشی منظور کرلیا۔ ملک شام کا یہ دوسرا سفر اب وہیں کی دعوت اور طلب پر تھا جس کی خوشی طبعی وفطری تھی، بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ: ''علامہ صفی الدین بداؤنی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقع ملا۔'' (أیضا:۱/۴۲۱)

وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے حضرت مولاناؒ کا یہ سفر عالم اسلام کے ممتاز علماء ومفکرین سے روابط مضبوط کرنے اور اپنی بات کو عالم گیر سطح پر پہنچانے کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس سفر میں حضرت مولاناؒ کی وہاں کے ریڈیو پر زبردست تقاریر نشر ہوئیں اور وہاں کے بااثر لوگوں سے بھی خوش گوار ملاقاتیں رہیں۔ ہندوستان واپسی کے بعد دمشق کی مجمع علمی نے حضرت مولاناؒ کو اپنی اکیڈمی کا رکن منتخب کیا جس کی صدر جمہوریہ کی طرف سے سند آئی، حضرت مولانا کہتے ہیں:

''اس کی رکنیت کسی عالم ومحقق کے لیے بڑے اعزاز کی بات

سمجھی جاتی تھی۔" (أیضا:۱/۴۳۶)

حضرت مولاناؒ نے اپنے دوسرے سفر حجاز میں جو محسوس کیا تھا کہ عالم عربی میں اپنی فکر کی نشر واشاعت کے لیے ضروری ہے کہ مصر کے راستے سے داخل ہوا جائے۔ آپ کی یہ دور رسی اس وقت حقیقت بن کر سامنے آئی جب سفر مصر کے تقریباً چھ سال بعد ۱۹۶۲ء میں شاہ سعود کا ذاتی خط موصول ہوا جس میں مرقوم تھا کہ "ہماری یونیورسٹی چاہتی ہے کہ مولانا وہاں تدریسی خدمت قبول کریں۔" (أیضا:۱/۴۷۳)

حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں کہ شاہ سعود کا ذاتی طور پر جلدی سے کسی کے نام خط لکھنے کا مزاج نہ تھا مگر اس موقع پر انہوں نے یہ خصوصیت برتی، تاہم حضرت مولاناؒ نے یہاں بھی وہی جواب دیا کہ چند دنوں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آنا منظور ہے ورنہ نہیں۔ الحمدللہ حضرت کی یہ تجویز منظور ہوئی اور حضرت مولاناؒ مدینہ منورہ بھی اسی حیثیت سے تشریف لے گئے، وہاں آپ کے علمی وفکری اور دعوتی محاضرات ہوئے جن میں مملکت کے چیدہ حضرات موجود ہوتے تھے۔

حسن اتفاق کہ اسی زمانہ قیام کے اثناء ایام حج آ گئے اور حضرت مولاناؒ نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سعودی مملکت کے حکام اور علماء وفضلاء حضرت مولاناؒ پر فدا تھے، اسی لیے اس حج کے دوران یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ مصلی شافعی کے اوپر مئذنہ سے حجاج کو خطاب کرنے کا اللہ نے موقع عطا کیا۔

یوں تو حضرت مولاناؒ نے اپنے پہلے سفر حجاز ہی میں شاہان مملکت سے دعوتی مراسم جاری کر دیے تھے، مگر اس سفر میں اس کے مواقع زیادہ فراہم ہوئے کہ حضرت مولانا تخلیہ کی ملاقاتوں میں ان کے سامنے اپنا درد دل بیان کر سکیں۔ اس سلسلہ میں امیر فیصل سے حضرت کی ملاقات بطور خاص قابل ذکر ہے، جس میں انہوں نے حضرتؒ کی بات سننے کے بعد یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ

"یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جو مرکز اسلام کے مقام وپیغام کے منافی ہو۔" (أیضا:۱/۴۸۳)

اسی سفر میں رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا، جس کی پہلی نشست شاہی محل میں منعقد ہوئی اور اس کی بعض نشستوں کی صدارت حضرت ہی نے فرمائی۔ ہندوستان واپسی سے قبل رابطہ عالم اسلامی کی ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت مولاناؒ مدینہ یونیورسٹی کی مجلس استشاری کے رکن بھی بنا دیے گئے۔ حضرت مولاناؒ لکھتے ہیں:

"اس مبارک آغاز کے ساتھ حجاز مقدس کی سالانہ حاضری اور بعض دو مرتبہ دو دو مرتبہ کی حاضری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وعدۂ خداوندی ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ کا ظہور ہوا۔"
(أیضا:۱/۴۷۸)

ملک شام کے دوسرے اور عالم عربی کے تیسرے دعوتی سفر کے بعد حضرت مولاناؒ کا نام اور ان کا مقام کسی علم دوست اور صاحبِ اثر کے لیے اجنبی نہ رہا۔ اس کے بعد آمد ورفت کا لامحدود سلسلہ جاری ہو گیا۔ حضرت مولاناؒ وقتاً فوقتاً علماء ومفکرین کے ساتھ شاہان مملکت کو ناصحانہ انداز میں خطوط لکھتے اور جب بھی موقع ہوتا تو مل کر ان سے دوٹوک گفتگو کرتے مگر آپ کا انداز ایسا ناصحانہ اور حکیمانہ تھا کہ شاہان مملکت آپ کی دست بوسی کو اپنا شرف سمجھتے، آپ کا ادب واحترام کرتے، آپ کی بات کو سننے کی خواہش ظاہر کرتے، آپ کی رائے کو ترجیح دیتے اور بعض مرتبہ ہندوستان واپسی پر ایرپورٹ تک رخصت کرنے کے لیے بطور اعزاز ساتھ میں آتے۔

عالم اسلام میں حضرت مولاناؒ کی اس محبوبیت ومقبولیت کا نتیجہ تھا کہ فیصل ایوارڈ جس کی حیثیت واہمیت عالم اسلام میں نوبل پرائز سے کم نہیں ہے، ۱۹۸۰ء میں حضرت مولاناؒ کو دیا گیا اور یہ کوئی واحد موقع نہ تھا جس کے ذریعہ عربوں نے آپ کی قدردانی کا اظہار کیا ہو بلکہ ایسے بے شمار قیمتی ایوارڈ پیش کیے گئے اور عزوشرف کے ہر موقع پر حضرت مولاناؒ کو اہل عرب نے اپنا رہبر وامام تسلیم کیا اور ہر ایک نے ان کے علم وفضل کا کھل کر اعتراف کیا۔

علامہ شیخ علی طنطاویؒ کی یہ گواہی بڑی ہی معنی خیز ہے کہ "میرے علم کے مطابق دعوت کے مروجہ اسلوبوں میں آپ کے اسلوب سے زیادہ شاید ہی کسی کا اسلوب مناسب ہوگا۔"

علامہ شیخ یوسف قرضاویؒ کا مشہور جملہ ہے کہ

''شیخ ندوی کے رسائل وتصنیفات نئی زبان اور تازہ روح کے حامل ہیں۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بعض مرتبہ ایسی چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کی طرف عموماً توجہ نہیں جاتی۔''

شامی عالم شیخ محمد مجذوبؒ فرماتے ہیں کہ

''آپ کی گفتگو کانوں میں رس گھولتی ہے اور آپ کی باتوں میں ایسی حقیقت بھری ہوئی ہے کہ اس کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔''

حضرت مولاناؒ کے تمام تر عربی خطابات کا مغز یہ ہوتا تھا کہ عربوں کی عزت اسلام سے وابستہ ہے اور عربوں کا تابناک مستقبل حضرت محمد ﷺ کے نقش قدم کی سو فیصد اتباع میں مضمر ہے۔ ایک موقع پر جب کہ عرب کا کریم طبقہ موجود تھا' حضرت نے فرمایا:

''جزیرۃ العرب کی یہ سرزمین اور یہ تمدن وترقی اور اس سرزمین پر اسلام کو ابدی طور پر مالکانہ اور قائدانہ حقوق واختیارات حاصل ہیں اور یہ اپنے پورے طول وعرض کے ساتھ اس کا حرم اور اس کا قلعہ ہے۔ اس لیے یہاں کسی کو باہر سے درآمد کیے ہوئے فلسفوں کی تبلیغ یا ترسیخ کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور نہ ان بنیادوں پر تیشہ چلانے کی جو صحابہ کرامؓ وداعیان ومجاہدین اسلام نے تعمیر کیں۔ جس ''دانشور'' ''معلم''، ''مفکر'' اور ''مصنف'' کو اس سے اتفاق نہ ہو وہ اس سرزمین کو خیرباد کہے۔ اس کے لیے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے پوری دنیا پڑی ہے، یہاں اس کو تخریبی اور انتشار انگیز عمل کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ بقول اقبال ؎

نہیں وجود حدود وثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی''

(کاروان زندگی: ۲/۴۰-۴۱)

حضرت مولاناؒ کی اہل عرب سے مخلصانہ اپیل یہ تھی کہ وہ بے شک موجودہ تمدنی سہولتوں اور سائنسی ترقیات سے استفادہ کریں مگر اسلام کے اخلاقی اصولوں اور معاشرتی تعلیمات پر کاربند وپابند بھی رہیں۔ حضرت مولاناؒ کہتے تھے کہ اگر منصوبہ بند طریقہ سے مسلم ممالک اس پر عمل کریں گے تو یہ چیز دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے لیے بجائے خود باعثِ کشش ہوگی مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

''مشرق ومغرب' عرب وعجم کے کسی اسلامی ملک کو بھی اس کی توفیق نہیں ہوئی، نہ ان میں سے کسی ایک کو اتنی جرأت ہوئی کہ وہ تجربہ کے طور پر ہی ایسا کرکے دیکھتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سبب ممالک مغربی کتاب تمدن کا ایک ناقص اور غلط ایڈیشن اور ایک روکھی پھیکی تصویر بن کر رہ گئے جو اہل مغرب کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی۔''

(حجاز مقدس: ۷۵-۷۶)

جب عرب قومیت کا فتنہ کھڑا ہوا تو حضرت مولاناؒ نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور ہر سطح پر صاف صاف یہ اعلان کیا کہ ''عرب قومیت میں غیر عربوں کے لیے کوئی کشش نہیں، ان کے لیے صرف ایمان' عمل صالح' اسلام کے پیغام اور دعوت میں کشش ہے۔''

(کاروان زندگی: ۲/۷۶)

حضرت مولاناؒ نے عالم اسلام اور بالخصوص عالم عربی کے علماء وادباء' دعاۃ ومفکرین کو تاعمر اپنا مخاطب بنایا، وہاں کے بادشاہوں اور امراء طبقہ کے مابین ہمیشہ حق بات کہی اور وہاں کے عوامی طبقہ سے بھی خطاب کیا۔ گویا ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ عربوں میں خدمتِ دین کرتے ہوئے گذرا۔ حضرت مولاناؒ پُرجوش انداز میں فرماتے تھے:

''میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین' اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے۔ عربی دنیا کے اس پورے اثاثے اور سرمایے پر جس کی حفاظت اور سربلندی کے لیے قومیتِ عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے، میرا حق کسی طہ حسین' کسی عقاد' کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں۔ میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے:

میرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی''

(أیضاً: ۲/۷۳)

دنیا کی قابل رشک قومیں

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

﴿فَلَمَّا نَسُواْ مَا ذُكِّرُواْ بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى إِذَا فَرِحُواْ بِمَا أُوتُواْ أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ﴾(الأنعام: ٤٤) (پھر جب وہ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی انہیں نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کردیے یہاں تک کہ جو چیزیں ان کو ملی تھیں جب ان پر وہ خوب اترا گئے تو ہم نے دفعۃً انہیں پکڑ لیا پھر وہ ہکا بکا رہ گئے۔)

''کلام پاک میں بعض اگلی شامت زدہ گمراہ قوموں کا ذکر کرکے ارشاد ہوتا ہے کہ جب وہ لوگ احکام الٰہی سے برابر غفلت ہی برتتے رہے اور چونکانے سے نہ چونکے تو مشیت الٰہی نے دفعۃً انہیں کوئی سزا نہیں دی، فوراً ان پر در رزق بند نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ان پر ہر شے کے دروازے کشادہ کردیے گئے؛﴿فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ان کی آمدنیاں بڑھنے لگیں، ان کے دولت و اقبال میں ترقی ہونے لگی، ان کا جاہ و حشم عروج پر آگیا یہاں تک کہ وہ اپنی ان کامیابیوں اور کامرانیوں کے نشہ میں اور زیادہ مست و سرشار ہوگئے، خود پرستی اور خدا فراموشی میں اور زیادہ منہمک ہوگئے، اپنی فتح مندیوں، خود بینیوں اور خود اعتمادیوں کے گھمنڈ میں اور زیادہ آ گئے۔ اس وقت ان پر یک بیک قہر الٰہی نازل ہوا اور وہ پاداش عمل میں دھر پکڑے گئے۔

آج آپ کو سود خواری کی تلقین دی جاتی ہے اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دیکھیے مغرب کی سود خوار قومیں کیسی خوش حال ہیں۔ آج آپ کو شریعت شکنی کا سبز باغ دکھایا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ دیکھئے مغرب کی اقبال مند قومیں ان قیود سے آزاد ہو کر کیسی کیسی ترقیاں کر رہی ہیں۔ کلام پاک کی جو تصریح آپ کی نظر سے گذری، اس کے بعد اس قسم کے دلائل و شواہد کا کوئی وزن باقی نہیں رہ جاتا۔ ''خوش قسمت'' اور ''اقبال مند'' اور ''قابل رشک'' وہ قومیں نہیں جن کا آغاز خوش گوار ہوتا ہے بلکہ وہ ہیں جن کا انجام خوش گوار ہوتا ہے۔ گھوڑ دوڑ میں بازی اسی گھوڑے کے ہاتھ میں نہیں رہتی جو دوڑ کے شروع میں آگے رہتا ہے، بازی اس کے ہاتھ رہتی ہے جو خاتمہ پر سب سے آگے ہوتا ہے۔ فرعون اور نمرود، ہامان اور قارون اور قوم عاد و ثمود سے زیادہ شاندار اور زیادہ با اقبال ''آغاز'' کس کا ہوا؟ لیکن ''انجام'' آخرت میں نہیں اسی دنیا میں جو کچھ ہوا ہے اس کا تذکرہ بھی قرآن ہی میں محفوظ ہے۔ خوش حالی اور اقبال مندی کو لازمی طور پر اور ہر حال میں کسی قوم کی ''اصلاح'' و ''فلاح'' کی دلیل قرار دینا قرآن پاک کی تعلیم سے یکسر بیگانگی کا ثبوت دینا ہے۔'' (سچی باتیں: ۵۶-۵۸)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 16 ✦ October 2024 ✦ Issue: 10

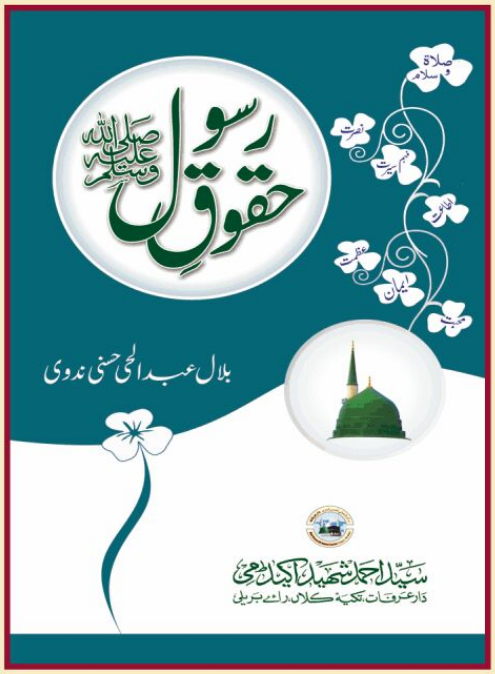

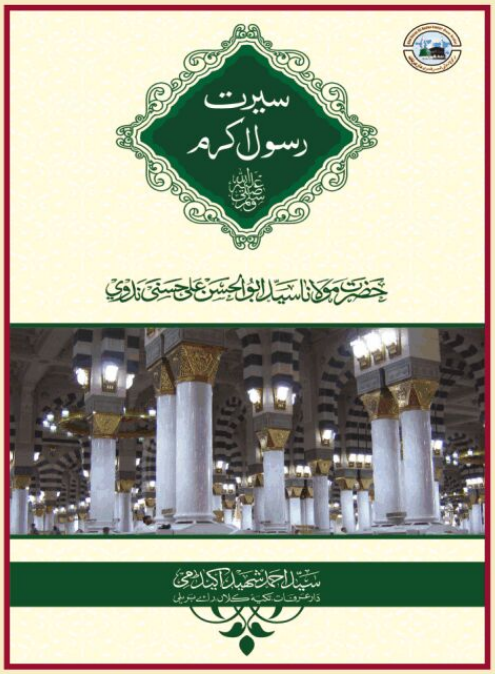

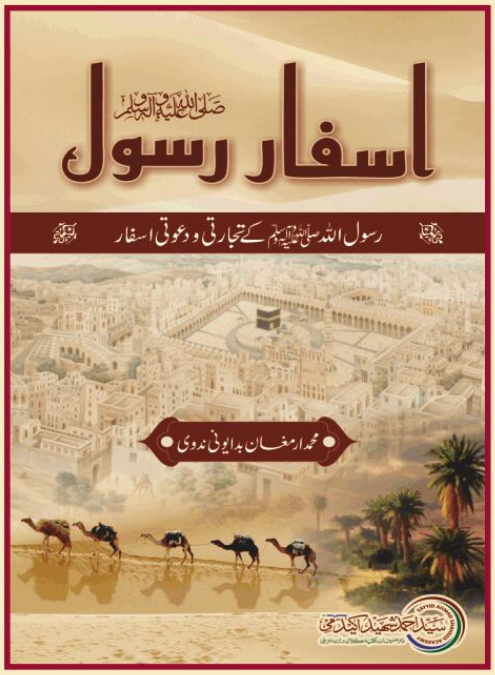

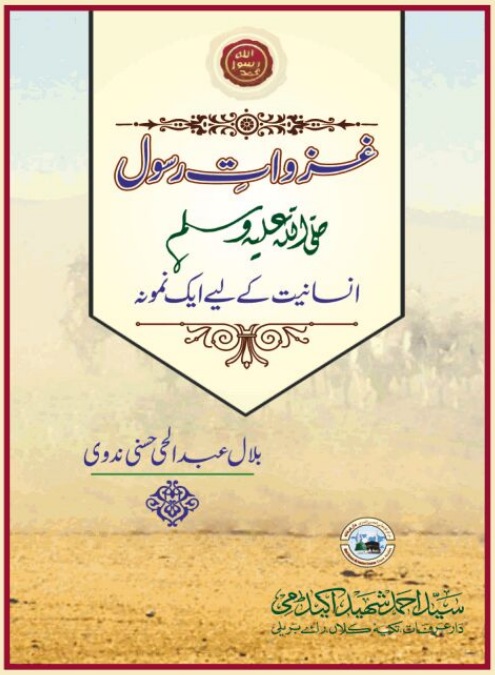

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)